بھارت: پڑوس اور دیگر ممالک سے تعلقات

جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی ملک کتنا طاقتور ہے تو پھر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے دائرۂ اثر میں کتنے ممالک ہیں۔ بھارت کی بات کریں تو شروع سے ہی اس کی یہ پالیسی رہی ہے کہ اس کے تعلقات پڑوسی ملکوں سے اچھے رہیں، بھارت کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ اس کا دائرۂ اثر تو بڑھے مگر بقائے باہم کی پالیسی پر چلتے ہوئے، چنانچہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب دنیا دو خیموں، امریکہ اور سوویت یونین، میں منقسم ہوگئی تھی تو بھارت کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے جمال عبدالناصر اور ٹیٹو جیسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ناوابستہ تحریک کی تشکیل کی۔ ناوابستہ تحریک ان ملکوں کے لیے راحت افزا تھی جو امریکہ اور سوویت یونین میں سے کسی بھی خیمے میں شامل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ نہرو نے چین سے بھی رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں 'ہندی چینی بھائی بھائی' کے نعرے لگا کرتے تھے مگر چین نے ہندوستان پر حملہ کر کے یہ بتا دیا کہ وہ بھائی تو کیا ایک اچھا پڑوسی بھی نہیں ہے، وہ محض ایک توسیع پسند ملک ہے۔ پاکستان نے بھی ہندوستان کی کوششوں کا مثبت جواب نہیں دیا اور ایک سے زیادہ بار اس نے بھارت پر حملہ کیا، البتہ 1971 میں یہ بات واضح ہوگئی کہ بھارت کا پاکستان سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔ اس کے بعد سے پاکستان نے دہشت گردی کو بھارت کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے بھارت کے وہ رشتے نہیں بن سکے جو دیگر پڑوسیوں سے ہیں۔ بنگلہ دیش سے بھارت کے اچھے تعلقات ہیں۔ دونوں ممالک اپنے تعلقات کو اہمیت بھی دیتے ہیں۔ نیپال اور بھوٹان بڑی حدتک بھارت پر انحصار کرتے ہیں۔ نیپال 50 فیصد سے زیادہ کا ایکسپورٹ بھارت کو کرتا ہے۔ اسی طرح بھوٹان 80 فیصد سے زیادہ کا ایکسپورٹ بھارت کو کرتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نیپال اور بھوٹان کس حدتک بھارت پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ دونوں ممالک بھارت سے لسانی اور ثقافتی طور پر بھی وابستہ ہیں، بھارت سے ان کے رشتے صدیوں پرانے ہیں۔ نیپال سے تو بھارت کا رشتہ 'روٹی اور بیٹی' کا ہے۔ سری لنکا کے حالیہ بحران میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تعاون بھارت نے ہی دیا ہے مگر نیپال کی طرح سری لنکا میں بھی ایسے لیڈران ہیں جن کا جھکاؤ چین کی طرف ہے۔ دیگر ملکوں کی بات کی جائے تو ایک عرصے تک بھارت کسی حدتک امریکہ پر سوویت یونین کو ترجیح دیتا رہا مگر آج اس کے تعلقات روس سے بھی ہیں اور امریکہ سے بھی۔ بھارت نے ایران اور عرب ملکوں سے بھی ایک ساتھ اچھا رشتہ رکھا ہوا ہے جبکہ یمن کی جنگ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایران اور عرب ممالک کے تعلقات تلخ ہیں۔ ■

کھلاڑی کر رہے ہیں صلاحیتوں کا اظہار!

ادھر کے برسوں میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی کارکردگی کی تازہ مثال 2022 کامن ویلتھ گیمز ہیں۔ ان میں تمغوں کے حصول کے معاملے میں ہندوستان چوتھے نمبر پر رہا۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے 22 گولڈ، 16 سلور اور 23 برونز سمیت 61 میڈل جیتے جبکہ تیسری نمبر پر کنیڈا رہا۔ اس نے 92 میڈل جیتے لیکن اس کامیابی کی امید بھی آج سے 5 دہائی پہلے کے ہندوستانی کھلاڑیوں سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت کھیلوں کے تئیں لوگوں کا رجحان نہیں تھا، رجحان تو تھا مگر کھیلوں میں اتنے مواقع نہیں تھے، اتنے پیسے نہیں تھے۔ کھلاڑیوں کو یہ سوچنا پڑتا تھا کہ وہ کھیل کر کیا کریں گے، ان کا گھر کیسے چلے گا۔ ان کے گھر کے اور آس پاس کے لوگ بھی ان سے کہا کرتے تھے کہ کھیل کر خود کو برباد مت کرو، کچھ کرو مگر آج حالات بدل گئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ حالات بدلنے کی ابتدا کب سے ہوئی۔ اس سلسلے میں سینئر کھیل صحافی، منوج چترویدی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ 'صحیح معنوں میں ہندوستانی کھیلوں میں پیسہ لگانے کی شروعات کرنے والا کرکٹ ہے۔ 1983 میں کپل دیو کی سربراہی میں کرکٹ ورلڈ کپ جیتنے کے بعد بی سی سی آئی سربراہ جگموہن ڈالمیا نے کرکٹ میں پیسہ لانے کی شروعات کی۔ اب تو بھارت کرکٹ کھیلنے والے ملکوں کے سبھی اداروں میں سب سے زیادہ پیسے والا ہے۔ صحیح معنوں میں ہندوستانی کھیلوں میں 1990 کی دہائی سے پیسے آنے کی شروعات ہوئی۔ نتیجتاً کھیل کی سہولتوں میں بہتری آنے لگی۔ ملک کی اقتصادیات میں آئی بہتری کا بھی یہ نتیجہ تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ دہائی میں تو بھارت کے کھیلوں کی ایکدم سے صورت ہی بدل گئی۔ اس کی ایک وجہ سرکاروں کا کھیلوں پر خرچ کو بڑھانا تو تھا ہی، ساتھ ہی پرائیوٹ سیکٹر کے سامنے آنے سے بھی حالات زیادہ بہتر ہوئے۔' سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ اب کسی ایک کھیل پر توجہ نہیں دے رہے ہیں، وہ اپنی صلاحیتوں اور رجحانات کے حساب سے کھیلوں کا انتخاب کر رہے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ وہ اپنے ملک کے لیے گولڈ میڈل حاصل کریں۔ گرچہ آج بھی کرکٹ ہی سب سے زیادہ مقبول ہے مگر دیگر کھیلوں سے بھی لوگوں کی دلچسپی بڑھی ہے اور مزید بڑھے گی، کیونکہ کسی بھی کھیل سے لوگوں کی دلچسپی تبھی بڑھتی ہے جب اس میں اس کے ملک کے کھلاڑی اچھا کرتے ہیں۔ اس کی مثال پی ٹی اوشا اور ثانیہ مرزا کی کامیابیاں ہیں۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ وطن عزیز ہندوستان میں کھیلوں کی طرف دیر سے توجہ دی گئی مگر اس کے باوجود ہندوستانی کھلاڑیوں نے جس تیزی سے کامیابیاں حاصل کی ہیں، وہ امید افزا بھی ہیں، حوصلہ افزا بھی۔ ■

وطن عزیز ہندوستان میں کھیلوں کی طرف دیر سے توجہ دی گئی مگر اس کے باوجود ہندوستانی کھلاڑیوں نے جس تیزی سے کامیابیاں حاصل کی ہیں، وہ امید افزا بھی ہیں، حوصلہ افزا بھی۔

◎ اتحاد میں معاون بنی گنگا جمنی تہذیب ◎

ہندوستان کو آزادی تقسیم کے بعد ملی تھی، اس وقت لوگوں کو متحد رکھنا کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کے ساتھی یہ جانتے تھے کہ ہندوستان کو مستحکم بنانے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ یہاں امن قائم ہو تاکہ اقتصادی سرگرمیاں بحال ہو سکیں، معمولات زندگی پٹری پر آ سکے۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ دلوں سے نفرت مٹائی جائے، ہندوستانیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ملک بٹا ہے، وہ نہیں بٹیں ہیں اور یہ بات ٹھیک بھی تھی، کیونکہ جن کو جو ملک چننا تھا، انہوں نے وہ ملک چن لیا تھا۔ ایک تعداد میں ہندو پاکستان میں رہ گئے تھے جبکہ مسلمانوں کی معمولی تعداد ہی پاکستان گئی تھی، باقی لوگوں نے ہندوستان کو ہی اپنا وطن مانا تھا۔ اس وقت فن و ادب اور فلم والوں نے دلوں سے کدورتیں نکالنے میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ محبوب خان، راج کپور اور گرودت جیسے ہدایت کاروں نے یہ احساس دلایا کہ ہندوستان کے لوگوں کو سماجی مسئلوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس وقت کی اکثر فلموں میں مسلمان ہیرو کی دوستی ہندو سے اور ہندو ہیرو کی دوستی مسلمان سے دکھائی جاتی تھی جیسے 'میرے محبوب' میں انور حسین انور (راجندر کمار) کا دوست بندادین رستوگی (جانی واکر) ہے تو 'چودھویں کا چاند' میں اسلم (گرودت) کا دوست مرزا شیدا (جانی واکر) ہے۔ اسی طرح 'زنجیر' میں انسپکٹر وجے کھنہ (امیتابھ بچن) کی مدد شیر خان (پران) کرتا ہے تو 'دھول کا پھول' میں مہیش کپور (راجندر کمار) اور مینا کھوسلا (مالا سنہا) کے بچے کی پرورش عبدالرشید (منموہن کرشنا) کرتا ہے۔ آخر اس طرح کے کرداروں کو رکھنے کا مقصد کیا تھا؟ اس طرح کے کرداروں کو رکھنے کا مقصد اس سماج کو دکھانا تھا جو ہندوستان کا سماج ہے، جس کی روح گنگا جمنی تہذیب تھی۔ اس تہذیب کو پروان چڑھانے میں ادیبوں اور شاعروں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ گنگا جمنی تہذیب نے ہندوستان کے لوگوں کو متحد رکھنے میں نہایت اہم رول ادا کیا مگر کیا آج کے ادیبوں، شاعروں اور فلم والوں کے لیے بھی گنگا جمنی تہذیب اہمیت کی حامل ہے؟ اس سوال کا جواب ایک جملے میں دینا مشکل ہے، کیونکہ کئی بار فلم والوں کی طرف سے جو بیانات آتے ہیں، وہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تبدیلیوں کا اثر ان پر بھی پڑ رہا ہے۔ ■

امرت مہوتسو اور مسلم مجاہدین آزادی

ڈاکٹر سید احمد قادری

سیکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ایسے مسلم مجاہدین آزادی کے نام ہیں، جنھوں نے نہ صرف 1857 کی بغاوت میں بلکہ نمک ستیہ گرہ تحریک، ہندوستان چھوڑو تحریک، کاکوری کیس، قصہ خوانی بازار میں، جلیان والا باغ کے خونیں واقعے، ناگپور جھنڈا تحریک وغیرہ میں اپنے ایثار و قربانی سے حب الوطنی کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ حقیقت پسند اور سیکولر انگریز تاریخ داں بھی مسلمانان ہند کی قربانیوں کا اعتراف کر چکے ہیں اور کرتے ہیں۔

ملک کی آزادی کو 75 سال ہو گئے، جو ہم تمام ہندوستانیوں کے لیے باعث فخر ہے۔ اس جشن آزادی کو حکومت ہند نے 'امرت مہوتسو' کا نام دیا ہے۔ اس جشن پر حکومت ہند کی جانب سے 'ہر گھر ترنگا' کی مہم چلائی گئی ہے۔ حالانکہ یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے خاص موقع پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی بھی فخر کے ساتھ ملک کا پرچم اپنے مکانوں، دوکانوں پر لہراتے ہیں۔ یہ عمل کسی کے کہنے یا مہم کے تحت نہیں ہوتا آیا ہے۔ بلاشبہ بیگم ثریا طیب کا ڈیزائن کردہ یہ قومی پرچم امن اتحاد، ہم آہنگی، یکجہتی اور قومی اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ امرت مہوتسو کے اس جشن پر 'گھر گھر ترنگا' مہم اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جن لوگوں نے اس قومی پرچم کی اہمیت اور تقدس کو 52 برسوں تک نہیں سمجھا، وہ بھی اس مہم میں پیش پیش ہیں۔ آزادی کے 75 سال کسی بھی ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کم نہیں ہیں۔ اسی ملک کے ایک بادشاہ شیر شاہ نے صرف پانچ سال کی مدت میں ملک کی ایسی کایا پلٹی تھی کہ آج بھی ان کے بنائے نشانات پر ہم آگے بڑھ رہے ہیں، اس لیے بہتر ہوتا اگر اس آزادیٔ ہند کے جشن پر محاسبہ کرتے کہ اتنے برسوں میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ ملک کی آزادی کے لیے جن لوگوں نے قربانیاں دی ہیں، انہیں یاد کیا جاتا تاکہ نئی نسل اور آنے والی نسل کے دلوں میں حب الوطنی کے احساسات و جذبات میں اضافہ ہوتا لیکن افسوس کہ موجودہ حکومت ہر ایسے موقع کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے اور گزشتہ چند برسوں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ آزادی میں مسلمانان ہند کی قربانیاں شامل نہیں ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ آزادیٔ ہند کے اس جشن پر تاریخ کے ان اوراق کو پلٹا جائے جنہیں مسلم مجاہدین آزادی نے اپنے خون جگر سے لکھا ہے۔

ہندوستان پر زبردستی قابض ہونے والے اور ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنانے والے انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور قربانیوں کو منصوبہ بند طور پر فراموش کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور جنگ آزادی کی نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ نصاب سے جنگ آزادی کے ایسے رہنماؤں کو خارج کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ملک کو انگریزوں کے ناپاک چنگل سے آزاد کرانے میں مسلمانوں کی جو قربانیاں رہی ہیں، وہ ملک کی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ ایسی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششیں کامیاب ہونا مشکل ہے کہ مسلمانان ہند کے لہو سے لکھی گئی یہ تاریخ ملک اور بیرون ممالک کی لائبریریوں اور آرکائیو میں موجود ہیں۔ ہاں! ملک کے نصاب سے جنگ آزادی کے ایسے رہنماؤں کو خارج کر کے معصوم بچوں کے معصوم ذہن کو ضرور پراگندہ کیا جا سکتا ہے۔

اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے اور جاننے والے بھی بخوبی واقف ہیں کہ آزادیٔ ہند کے لیے ملک کے مسلمانوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ ہم اس بات سے بھی قطعی انکار نہیں کر سکتے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے اہل وطن کی بھی قربانیاں رہی ہیں لیکن جنگ آزادی کی بھرپور اور غیر متعصبانہ تحقیق کی جائے تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی قربانیاں ان کے مقابلے کہیں زیادہ رہی ہیں۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے کہ جس وقت ملک پر انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کیا تھا، اس وقت اس ملک میں مسلمانوں کی حکمرانی تھی جنہیں بتدریج بے دست و پا کر کے انگریزوں نے ملک پر ناجائز اور ناپاک قبضہ کیا تھا، اس لیے انگریزوں کی نگاہ میں یہاں کے مسلمان ہی ان کے لیے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ 1857 کی بغاوت باضابطہ انگریز حکمرانوں کے خلاف پہلی کھلم کھلا بغاوت تھی۔ گرچہ بظاہر یہ بغاوت ناکام ہوئی اور اس بغاوت کی پاداش میں اس وقت 106 مسلمانوں کو پھانسی دی گئی تھی، 29 مسلم مجاہد آزادی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی لیکن اس بغاوت کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ انگریز حکمرانوں کے ظلم و استبداد اور بے رحمانہ سلوک سے جو خوف ہندوستانیوں پر غالب تھا، وہ کسی حد تک دور ہوا تھا اور حکومت برطانیہ سے نجات کی کوششوں میں تیزی آتی گئی۔ اس بغاوت کے (بظاہر) اثرات کے کم ہو جانے کے بعد جب دلی شہر کے شہریوں نے واپس آنا شروع کیا، تو اس وقت ان شہریوں میں ہندوؤں کو واپس آنے کی پہلے اجازت دی گئی اور ان کے بعد مسلمانوں کو 18 اپریل 1858 کو اپنے شہر واپس آنے کا حکم دیا گیا تھا اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اپنی جائیداد کا 25 فیصد ٹیکس انگریز حکومت کو ادا کرنا ہوگا۔ اس طرح کے کئی ایسے واقعات سامنے آئے، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کی نگاہ میں سب سے بڑے اور سامنے کے دشمن بھارت کے مسلمان ہی تھے۔ یہی وجہ تھی انگریزوں کے ہمیشہ خاص نشانہ بھارت کے مسلمان ہی رہے۔ ان پر ظلم و زیادتی کی انتہا ہوتی رہی۔ انہیں کبھی توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا اور کبھی سیکڑوں کی تعداد میں علما اور مسلم مجاہدین آزادی کو انگریزوں کے حکم عدولی پر پھانسی پر لٹکایا گیا۔

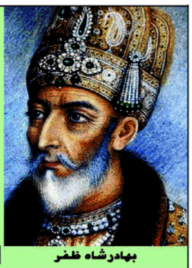

بہادر شاہ ظفر

اشفاق اللہ خان

حسین احمد مدنی

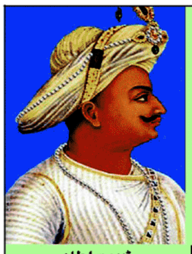

ٹیپو سلطان

حکیم اجمل خاں

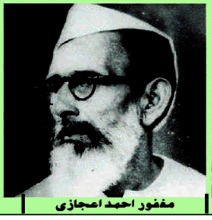

مغفور احمد اعجازی

ارونا آصف علی

حسرت موہانی

مسلم مجاہدین آزادی کے ایسے کارناموں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ 1857 کے انقلاب کے بعد آزادی کے متوالوں کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اور 1921 میں احمد آباد کانفرنس میں یہ حسرت موہانی ہی تھے، جنہوں نے 'مکمل آزادی' کی پہلی بار تجویز رکھی تھی، جسے شد و مد کے ساتھ موتی لعل نہرو، مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو نے 1929 میں آخر کار مان لیا تھا۔ یہ حسرت موہانی ہی تھے، جنہوں نے 1940 میں کانپور میں مزدوروں کے ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے پہلی بار 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا تھا۔ آج ہم بڑے فخر سے ملک کے لیے سرفروشی کی تمنا کی بات کرتے ہیں اور 'سرفروشی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے' سنا سنا کر مجاہدین آزادی کے دلوں میں ملک کے لیے محبت اور سرشاری کا جذبہ جگانے کے لیے جھوم جھوم کر ایسے اشعار سنایا کرتے تھے۔ اس کے خالق بسمل عظیم آبادی تھے۔ اپنے ملک سے اپنی محبت اور وابستگی کے جذبے کے اظہار کے لیے لوگوں کی زبان پر 'جے ہند' جیسے الفاظ آزاد ہند فوج سے تعلق رکھنے والے عابد حسین صفرانی کے ہی دیے ہوئے ہیں۔ اسپیس سے راکیش شرما کو 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کہنے کا حوصلہ علامہ اقبال نے دیا تھا۔

ملک کے لیے انگریزوں کے قہر و بربریت کا شکار ہونے والے، ہنستے ہنستے دار پر چڑھنے والے، جیل کی اندھیری کوٹھریوں کو آباد کرنے والے، اپنے جسم و دل پر زخموں کا پھول سجانے والے ایسے مسلم مجاہدین آزادی سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ایسے مجاہدین آزادی پر ایک اچٹتی سی بھی نظر ڈالیں تو ہمیں بے اختیار ٹیپو سلطان، حیدر علی خاں، عظیم اللہ خاں، بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ ایم سیانی، پیر علی، شیخ بھکاری، شیخ محمد گلاب، بی اماں، شوکت علی، محمد علی، محمد علی جوہر، شیر علی، مولانا منصور انصاری، محمد اشفاق اللہ خاں، پروفیسر عبدالباری، سیف الدین کچلو، مولانا حفظ الرحمٰن، محمد سلیمان انصاری، خالد سیف اللہ انصاری، شفیق الرحمٰن قدوائی، حکیم اجمل خاں، حضرت محل، قاضی محمد حسین، مظہر الحق، مختار احمد انصاری، آصف علی، حاجی بیگم، مولانا عبدالرحیم صادقپوری، مولانا احمد اللہ صادقپوری، دلاور خاں، سرسید سلطان احمد، محمد یونس، ڈاکٹر سید محمود، ابومحمد ابراہیم آروی، شاہ محمد زبیر، مغفور احمد اعجازی، سرسید محمد فخرالدین، سر علی امام، کرنل محبوب احمد، پیر محمد یونس، وارث علی، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی، مولوی محمد جعفر، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا یحییٰ، عبیداللہ سندھی، عطاءاللہ شاہ بخاری، مولوی عبدالغنی ڈار وغیرہ جیسے سیکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ایسے مسلم مجاہدین آزادی کے نام ہیں، جنہوں نے نہ صرف 1857 کی بغاوت میں بلکہ نمک ستیہ گرہ تحریک، ہندوستان چھوڑو تحریک، کاکوری کیس، قصہ خوانی بازار میں، جلیان والا باغ کے خونیں واقعے، ناگپور جھنڈا تحریک وغیرہ میں اپنے ایثار و قربانی سے حب الوطنی کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ حقیقت پسند اور سیکولر انگریز تاریخ داں بھی مسلمانان ہند کی قربانیوں کا اعتراف کر چکے ہیں اور کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق ان خونیں سانحات کے گواہ ہیں کہ تقریباً 65 فیصد مسلم مجاہدین آزادی نے ملک کو انگریزوں کی غلامی کی طوق سے نجات دلانے میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کے مسلم مجاہدین آزادی کی تفصیلات میں سے اگر میں ان کے متعلق دو دو جملے بھی لکھوں، تو مجھے یقین ہے کہ کئی ہزار صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی لیکن ایسا اہم تاریخی کام کوئی تن تنہا نہیں کر سکتا۔ ہاں! ریاستی سطح پر یہ کام ہو سکتا ہے اور ہر ریاست کے ادیب اور دانشور خاص طور پر تحقیق اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اپنی اپنی ریاست کی تاریخ آزادیٔ ہند میں مسلمانوں کے رول پر مبنی کتابوں کو شائع کرا کر اپنی شاندار اور سنہری تاریخ کو کسی حد تک محفوظ کر سکتے ہیں۔

ان دنوں اپنے ملک میں جس طرح کا متعصبانہ رویہ مسلمانوں کے تئیں اپنایا گیا ہے اور مسلمانوں کی شاندار تاریخ کو منصوبہ بند اور منظم طریقے سے مسخ کر نئی تاریخ لکھنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اس کے لیے جیسے جیسے متعصب تاریخ دانوں کے نام سامنے آ رہے ہیں، وہ ظاہر ہے ملک کے حقائق پر مبنی شاندار تاریخ کو مسخ کر کے اپنے زعفرانی منصوبوں پر عمل کرتے ہوئے ایسی تاریخ مرتب کر رہے ہیں، جو ہر حال میں 'مسلم مکت' تاریخ ہوگی۔ فرقہ پرستوں کی جانب سے ایسی کوششیں پہلے بھی ہوئی ہیں لیکن ایسا کرنے میں انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی تھی، اس لیے کہ اس وقت تاریخ دانوں اور دانشوروں میں سیکولرازم کے عنصر موجود تھے اور کمیونلزم عام نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی لیکن اب وقت اور حالات کمیونلزم کے موافق اور سیکولرازم کی مخالفت میں ہیں، اس لیے ایسے لوگ اب اپنے زعفرانی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کسی حد تک کامیاب ہو رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس وقت عرفان حبیب، رام شرن شرما، وشمبھر ناتھ پانڈے، بپن چندرا، رومیلا تھاپڑ، دیوجیندر نرائن جھا، رام چندر گوہا، برون ڈے، اے جی نورانی اور ستیش چندرا وغیرہ جیسے سیکولر اور دانشورانہ شان و صلاحیتوں والے تاریخ داں جوان متعصب اور جھوٹ پر مبنی تاریخ کو کالعدم قرار دے سکتے تھے، ان تاریخ دانوں میں سے کچھ گزر گئے جو چند بچے ہیں، وہ موجودہ حکومت کی سینہ زوری کو دیکھ کر خوف و ہراس میں ڈوبے خاموش بیٹھ گئے ہیں کہ وہ کلبرگی، دابھولکر، پنسارے، گوری لنکیش وغیرہ کا حشر دیکھ چکے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاستی پیمانے پر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے مصنفین اپنی اپنی ریاستوں کی پوری تاریخ تحقیقی حوالوں کے ساتھ لکھیں اور شائع کرائیں۔ اس وقت اگر ہم نے ان تاریخی فرائض اور ذمہ داریوں سے کوتاہی کی تو یقین جانیں کہ 'ہماری داستان تک نہ ہوگی تاریخ ہند میں'۔ ■

squadri806@gmail.com

نوٹ: 'دستاویز' میں شائع مضامین اور انٹرویوز میں مضمون نگاروں اور انٹرویو دینے والوں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کے لیے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں۔